khusro foundation

راکھ میں دبی چنگاری

نسرین حمزہ علی

راکھ میں دبی چنگاری

نسرین حمزہ علی

khusro foundation

KHUSRO FOUNDATION
www.khusrofoundation.org

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

© All Rights Reserved to Khusro Foundation 2025

Raakh Mein Dabi Chingaari

Nasreen Hamza Ali

ISBN: 978-81-989382-4-4

Rs. 100-

نامِ کتاب : راکھ میں دبی چنگاری

مصنف : نسرین حمزہ علی

صفحات : 64

سنہ اشاعت : 2025

تعداد : 500

قیمت : **100** روپے

ناشر : خسرو فاؤنڈیشن، ڈی319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی

Printed by

Creative Star Publications

Okhla, New Delhi

Email: creativestar1122@gmail.com

Call: 8851148278, 9958380431

فہرست

پیش لفظ	05
حرف آغاز	08
راکھ میں دبی چنگاری۔۔۔	10
بہادر تم	12
اک سوال	16
طوفانوں میں چراغ جلتے ہیں۔۔۔	19
بہتر سماج کی تعمیر۔۔۔	26
کمبل کا بوجھ	28
عورت کی کہانی	35
بیوہ کی چادر	38
بہار آنے تک	42
کوکھ کا درد	49
اسلام اور عورت	57
خسرو فاؤنڈیشن-ایک نئی پہل	61

Woman

No one can erase your story.
No one can measure your power.
No one can decorate the lamp of desire.
No one can forget you all their life.

— Nasreen Hamza Ali —

پیش لفظ

ایک دن اچانک صبح صبح فیسبک اسکرول کرتے ہوئے کسی اردو اخبار میں چھپی ایک کہانی ''بہادر تم'' پر نظر پڑی۔ معمول کے مطابق کچھ سطور پڑھنے کی کوشش کی تو پہلے ہی پیرگراف نے پوری کہانی پڑھنے پر مجبور کر دیا۔

کہانی کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی تھا جو ہمارے خود ساختہ معاشرے کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی گئی میری دلچسپی بھی مزید گہری ہوتی گئی۔ زبان و بیان کا استعمال، الفاظ کی بندش، جملوں کی ترکیب، زبان کی چاشنی سب کچھ ایک ان سنے اور اجنبی خاتون قلمکار کی کہانی میں اتنا پختہ تھا جس کو پڑھ کر مولانا آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کی شیرینی، منٹو اور قرۃ العین حیدر کی افسانہ نویسی، پروین شاکر کی جرأت اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری یاد آ جائے۔

پیج پر کچھ اور تلاش کرنے پر مزید کہانیاں سامنے آئیں جن میں سے تین کہانیوں کا مرکزی کردار عورت، معاشرہ، رسم و رواج اور مذہب تھا اور انہیں تینوں کہانیوں ''بہادر تم''، ''راکھ میں دبی چنگاری'' اور ''اک سوال'' نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس قلم کار تک رسائی حاصل کروں جس کے اندر مستقبل کی بانو مشتاق بننے کی خوبیاں نمایاں ہیں۔

چونکہ خسرو فاؤنڈیشن اچھے قلم کاروں اور نئے لکھنے والوں کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے اوران کو مزید موٹیویٹ کرنے پر یقین رکھتی ہے، اسی سوچ کے تحت ہم نے ''راکھ میں دبی چنگاری'' کی خالق محترمہ نسرین حمزہ علی صاحبہ کو ایک پیغام بھیجا کہ اگر آپ کی کہانیوں کی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے تو خسرو فاؤنڈیشن ان تین کہانیوں کی طرح 10 یا 12 مزید کہانیوں پر مشتمل آپ کی کتاب شائع کرسکتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں اور مزید کہانیاں روانہ کریں۔ ہم نے اس پیغام کے ساتھ خسرو فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ کا لنک بھی روانہ کیا تاکہ ان کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ ہم کس طرح کالٹریچر شائع کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے ان کو ایک مختصر اکرامیہ کی بھی پیشکش کی جو ہم اپنے قلم کاروں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

تقریباً 24 گھنٹے کے بعد نسرین صاحبہ کا جواب آیا کہ اگر خسرو فاؤنڈیشن ان کی کتاب شائع کرتی ہے تو یہ ان کے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔ مزید یہ کہ ان کو کوئی اکرامیہ نہیں چاہیے بلکہ ان کی آرزو تو بس اتنی ہے کہ ان کی فکر سماج کے شعور کو بیدار کر سکے۔ بقول بشریٰ اعجاز:

مجھے جانا ہے اس شہرِ طلسم آثار کی جانب
وہاں سوئے ہوئے ہر شخص کو بیدار کرنا ہے

نسرین حمزہ علی گو کہ دکنی لہجے کی ایک اچھی شاعرہ اور اردو کی ادیبہ ہیں جن کا کلام اور مضامین مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شاعری میں ان کے اب تک دو مجموعہ کلام منظرِ عام پر آچکے ہیں مگر وہ بنیادی طور پر ایک اچھی نثر نگار ہیں اور ان کی کہانیوں کے بنیادی کردار عورت، معاشرہ اور مذہب ہیں۔ آپ بیتی کو جگ

بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کا ہنر نسرین صاحبہ کو بخوبی آتا ہے۔

ان کی زبان و قلم کو قدرت نے ایسی انفرادیت بخشی ہے کہ ان کو پڑھنے کے بعد زبان کی بنیاد پر دکن یا شمال کا تعین کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ ان کی گفتگو اور شاعری میں وہ نظر آتے ہیں۔

نسرین صاحبہ کی کہانیوں میں معاشرے کے خود ساختہ رسم و رواج، مذہب کے نام پر پھیلائے گئے مکر جال اور عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور غیر برابری کے خلاف لڑنے والی ایک بہادر عورت کا کردار نظر آتا ہے جو ان کے قلم اور فکر کو اور معتبر بنا دیتا ہے۔ نسرین کی کہانیوں کا انداز اتنا جذباتی ہے کہ لگتا ہے جیسے ہر کہانی کا کردار وہ خود ہی ہوں۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہمارے قارئین ''راکھ میں دبی چنگاری'' کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور کتاب میں کہانیوں کے ذریعے اٹھائے گئے مسائل کا مثبت حل بھی تلاش کریں گے۔

خسرو فاؤنڈیشن کتاب کی مصنفہ نسرین حمزہ علی صاحبہ کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنا قلمی شاہکار پیش کیا اور اس کتاب کے لئے ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمن

کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن

حرف آغاز

سچی اور ناگزیر حقیقت کو کھوجتی ہوئی فریبِ سرور میں ڈوبی ایک لڑکی نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وقت کے سناٹوں میں اندر کے شور مچاتے طوفانوں کو منکشف کرے گی ، پھر اس کو اپنے احساسات وجذبات کی فصیلِ شہر میں محبت کی دھندلی تصویروں کے عکس جوڑنے کی کوشش میں ایک عورت کے درد کی کرچیاں بکھری ہوئی ملیں۔

گزرتے لمحوں کا احاطہ کرتے ہوئے آگے بڑھی تو اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ کہانی ایک اکیلی عورت کی نہیں ہے بلکہ ہر دور میں سماج کے وجود سے سارے دکھ چننے والی بہادر عورت کی کہانی ہے۔

کہانیوں کے کردار جب مجھ سے محوِ گفتگو تھے، تو محبتیں، رفاقتیں اور وفائیں ایک دوست کی طرح مہربان رہیں، کبھی ہونٹوں سے مسکراہٹیں پھوٹتی رہیں، کبھی پلکیں بھگوتی رہیں۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے درد وکرب لہولہان ہو کر جسم سے ٹپکتے رہے۔ سارا جسم چھلنی ہو گیا۔

''راکھ میں دبی چنگاری'' اسی سفر کا حصہ ہے جس میں عورت کے وقار کو کچل کر ان پر حکومتیں کرنا، ایک حقیر جان سمجھنا، یہ میری کہانیوں کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔

حقیقت کے وہ رنگ ہیں جو ہر عورت کی ذات سے منسوب ہیں۔ چاہے زمانۂ قدیم کی عورتیں ہوں یا زمانہ جدید کی عورتیں، دونوں کے درد مشترک ہیں۔ قلم سے محبت کرنا میرا جنون ہے، جواب الہام بن چکا ہے۔

اس تخلیق کے تمام مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے درد وکرب، سسکیاں، سرگوشیاں اور گفتگو کے تمام اسرار ورموز کو یکجا کرتے ہوئے تخلیق کے حسن کو الفاظ میں سموکر ایک آواز سماج کے روبرو پیش کرنے کی کوشش اس امید پر کی ہے کہ شاید آپ کو سنائی دے۔

''راکھ میں دبی چنگاری'' کی اشاعت میں اگر خوبی کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو اس پر تہنیت کی مستحق خسرو فاؤنڈیشن اوران کی ٹیم ہے۔اس کتاب کی تالیف واشاعت فاؤنڈیشن کے کنوینر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صاحب کی نگرانی میں عمل میں آئی جس کے لئے میں تہہ دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔ان کی ثابت قدمی، نرم مزاجی اور حسن سلوک نے اس سفر کو آسان بنایا۔

مجھے امید ہے کہ یہ بھولی بسری نوا جب اپنی بازگشت بن کر آپ کی سماعتوں پر دستک دے گی تو آپ اپنی محبتوں اور دعاؤں سے نوازیں گے۔

نسرین حمزہ علی

بیدر کرناٹک

راکھ میں دبی چنگاری۔۔۔

اک خاموش اور سرد رات میں اپنے ہی خیالوں کے تانے بانے میں الجھی سچی اور کڑوی حقیقت کو نگلنے کی کوشش کر رہی تھی، تب ہی اک واقعہ خیالات کے الجھتے تاروں میں پھنس کر پردہ ذہن پر اک فلم کی طرح دوڑ رہا تھا۔۔طلاق، طلاق، طلاق یہ تین الفاظ میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ کتنے بھدے اور بھیانک ہوتے ہیں۔ مانا کہ اللہ تعالیٰ نے چند وجوہات کی بناء پر جائز قرار دیے ہیں، جب دو لوگ آپسی فیصلہ کرتے ہیں لیکن جب یہ مرض پھیلتا ہے تو بہت ساری خوشیوں کو نگلتے ہوئے، یہ بکھری ہوئی پامال قدروں سے منحرف ہوکر اپنے لئے اک ایسا جہاں وجود میں لاتا ہے جسے ہمارے دل مشکل ہی سے قبول کرتے ہیں، جب دو لوگ اپنے مکان کو گراتے ہیں تو اس ملبے کے نیچے کئی رشتے دب جاتے ہیں جو بچی کچی سانسیں رہتی ہیں وہ بھی ان بند دروازے اور کھڑکیوں کے اندر قید ہوکر رہ جاتے ہیں، سب سے زیادہ نقصان بچوں کا ہوتا ہے، کم عمر کے بچے یہ بات قبول نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی مسلہ ہے تو اس کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے، اس کی وجوہات کے پیچھے کا سد باب تلاش کیا جا سکتا ہے، نقصان دونوں طرف بھی ہوتا ہے، تھوڑا کم زیادہ ہوسکتا ہے، جب

دونوں لحظہ بھر کے لئے نقطہ انظمام پر کھڑے ہو کر سماجی قدروں کے احترام کے ساتھ اپنے اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش کریں تو وقت اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیتا ہے، اپنی ذات، رائے اور انا کے پیچیدہ عمل تخلیق ہونے سے پہلے اپنے گلستان کی جڑوں کو مضبوط بنانا ہے جو کہ بہار کے ساتھ ساتھ موسم خزاں میں بھی محبت کی داستان پیش کرے اس طرح یہ رشتہ محبت کی معراج کے مدارج کا احاطہ کرتا ہے۔

طلاق کی وجہ کچھ بھی ہو، طلاق نامی طوفان کہرام مچا کر تہس نہس کر دیتا ہے، پہلے چھوٹی چھوٹی آندھیوں کا سر کچلا جانا ضروری ہوتا ہے جو کہ اکثر آگے بڑھ کر طوفان کا روپ اختیار کرتا ہے، طوفانوں کے زیرِ اثر آگے بڑھنے کی کوشش میں تازہ ہوائیں بھی زہر آلود ہو جاتی ہیں، اس لئے یکسوئی کے ساتھ مسلے کا حل نکال کر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کریں اور قطعی طور پر ایک دوسرے کو معاف کر دیا کریں۔ اس طرح کے ردعمل کی نوعیت کے اعتبار سے دونوں آپس میں خوش رہا کریں گے۔ دونوں خود کی ذات کے سلسلوں سے نکلنے کی کوشش کریں ایمان داری، محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کے لوازمات کو اپنی اپنی پلیٹ میں سجا کر خوش ذائقہ کا مزہ چکھتے رہیں۔

دونوں میں صلہ رحمی، دوستی محبتیں اور وفاؤں کا سنجوگ مل جائے تو وہ اپنی زندگیوں کو تراش کر سنوار کر رنگینیوں کی لو میں دمکتے نظر آئیں گے۔ اس طرح دونوں اپنی اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لئے اپنی سوچ اور زاویہ نگاہ کو ہر لمحہ تازگی دیں گے اور اس طرح ان کی محبت کے پھول خوش گوار فضاؤں میں حسین احساسات کے ساتھ ہمیشہ جوان اور تازہ رہیں گے۔

بہادر تم

اس مضمون کا مقصد عورت کی زندگی پر منحصر اس کے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے، آج تک عورت پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ یہ کوئی نئی ٹاپک نہیں ہے، لیکن میری آرزو ہے کہ میرے خیالات آپ تک پہنچاؤں۔ میرا یہ مضمون ایک شوق فضول لگا، کیوں کہ نہ تو عالمی خواتین ڈے ہے نا مدرس ڈے، لیکن میری خواہش جرأت رندانہ کی حد تک نہ سہی لیکن دل میں چھپی ایک ٹیس سی ہے۔

عورت بہت ہی بے آہٹ خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے اور بے آہٹ دنیا سے رخصت ہوتی ہے، ان تمام غفلتوں کے باوجود دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے، عورت زمانے قدیم کی ہو یا جدید اس کی فطرت میں رومانیت، محبت وقربانی قدم قدم پر ساتھ چلے ہیں جس کے نتیجے میں اس کے سوتے سے مہکتی وفاؤں کے چشمے پھوٹتے ہیں جس میں رومانی لپک کا جز ضرور شامل رہتا ہے، اس کی شخصیت ماحول سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے اس کی محبت وفائیں بہت نمایاں ہیں، ایک سلسلہ ایک کڑی گھر کے ماحول پر مشتمل ہے جہاں وہ محبت وقربانی کی داستان کو پیش کرتی ہے، ہر روپ میں بیٹی، بہن اور ماں۔

دوسرا سلسلہ بے وفائی اور نفرت کے تلازمات سے عبارت ہے۔لیکن اس کی کئی وجوہات ہیں، اس کے پیچھے کا ردعمل اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور معاشرے کے جارحانہ رویوں کی عکاسی، ان کے علاوہ کچھ اور بھی سلسلے ہو سکتے ہیں، مگر میں یہاں اہم ترین سلسلوں کے ذکر پر اکتفاء کرتی ہوں۔

قدیم عورت طوفانوں کے زیر اثر آگے بڑھی تو اس کو پہلی ہی یلغار میں شکست کھانی پڑی کم زور جسم کے ساتھ ذہن کو بھی کمزور سمجھ کر اہمیت نہیں دی گئی۔لیکن وہ ہمت نہیں ہاری جس کے نتیجے میں آج وہ بھی اہل کاروں کی فہرست میں شامل ہے، وہ اپنی کمزوری سے منحرف ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود سے وابستہ تلازمات کو بڑی خوبی سے اپنی قابلیت میں برتا اور خود کو اس خول سے باہر لانے میں کامیابی حاصل کی۔

ہر چند کام مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ عورت کو عزت ومحبت ملنے میں کامیابی حاصل ہوئی جہاں کہیں اس سے غرض رہی اس کو مدنظر رکھا اور جہاں ضرورت محسوس نہیں ہوئی نظر انداز کیا گیا۔

باپ دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیکھتے ہیں آج بھی آدمیوں کے مزاج میں برتری کے رنگ کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں، ان سب میں اگر محسوس کیا جائے تو چاہے قدیم ہو یا جدید عورت کے درد مشترک ہیں، ان کے ساتھ مشورے کرنے میں کئی قسم کی آلودگی پائی جاتی ہے۔

عورت کو اگر صحیح رتبہ دیا جائے تو اس کے دل ودماغ پر خوش گوار اثرات مرتب ہونگے اس طرح وہ حوصلوں اور ہمتوں کی آئینہ دار ہوگی، عورت کی گود میں بہترین ادبی اور تہذیبی اثاثہ محفوظ ہے نہ صرف اپنا بلکہ خاندان، قوم اور ملک کے بدلتے

ہوئے جدید تصورات سے ہم کنار ہو کر اس میں خوب صورت نئے رنگ بھرنے کی صلاحیت، اگر وہ زندگی اور عشق کے رشتے پر گہری نظر رکھتی ہے تو اسے جنون و وحشت کا بھی گہرا احساس ہے، اس کو بخشی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، اس سے عزت کا رشتہ استوار کیا جائے۔ ماں باپ کے لئے دل کو چھوتی گڑیا، شوہر کے لئے عشق و رومانیت کے کردار میں بسی اہم شکل اور بچوں کے لئے لاڈ و پیار کی خمیر سے گوندھا گیا آٹا، ان تمام خوبیوں کے باوجود عورت صرف ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

Womens day and Mothers day کے لئے ایک تکرار اور تھوڑا سا خوش فہمی میں اضافیت

اپنے ہی گھر میں اپنے حق کے لئے اکیلی لڑتے رہنا پڑتا ہے، شادی کی وداعی سے پہلے یہی جملے اس کی سماعت سے ٹکراتے رہتے ہیں، عورت ہے اپنے گھر کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا، بیوی و بہو کے کردار کو نہایت محبت واحترام کے ساتھ نبھاتے ہوئے ایک اور خوب صورت ذمہ داری لیکن وہ ماں بن کر اس ذمہ داری کو بڑی شان سے قبول کرتی ہے، اس کی کمر کبھی نہیں جھکتی بڑی شان سے کھڑی رہتی ہے۔

آج بھی عورت کو صنف نازک سمجھ کر ایک جھوٹے قلعے میں بند کر دیا گیا ہے جس کی دیواریں صرف یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ صرف لفظ میں زندہ ہے، اس کی جدوجہد سے واقف بھی ہیں لیکن اس کی متاع گراں خدمات ومحبت کا صلہ کم ہی ملتا ہے اس کو اپنی محبت کے محنتانہ کے بدلے میں ایک بھکاری کی طرح مانگنا پڑتا ہے، بے چاری کی زندگی ایک گداگر کی طرح ہے۔

ان تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود اپنے گھر کو جوڑنے میں سب کچھ داؤ پر لگا کر جیتی ہے، ہائے ظالم دنیا تو نے تو اندر کی عورت کو ہی توڑ دیا، وہ صرف رشتوں کی سطح کو بلند رکھنے کی کوشش میں ایک جزو بن کر رہ گئی۔

اک سوال

لمحوں کی دہلیز پہ کھڑی زینب سوچ رہی تھی کہ میرا اور عادل کا ملنا ایک اتفاق تھا لیکن اس کو حسین کہنا دشوار لگا۔ازدواجی بندھن گلے کی پھانس کی طرح چبھتا رہا۔

برس بیت گئے اس کے دل کی سنسان گلی میں دور دور تک سناٹا رہا اس کے وجود کی کرچیاں بکھری ہوئی کئی خوش آئند مستقبل کی دھندلی تصویریں اس کے لہولہان ہوتے خوابوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔

پھر کب اس نے اپنے خوابوں کے کواڑ بند کر کے زندگی کے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔کب اس کی جوانی کے بھرے جام کیسے خالی ہو گئے اور وہ شکستہ غمزدہ رہ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔

جس کے ساتھ مہکتی راتیں ہر دن سورج کی کرنوں کے جال بنتی رہی اس امید پر کہ کبھی تو خوب صورت موسم بہت دیر تک ٹھہرے گا اور وفا کی نرم زرخیز زمین میں پھول مسکائیں گے لیکن ہر روز اس کی آنکھ سے لہو ٹپکتا رہا،سرد ہوائیں اس کے جسم میں زہر گھولتی رہیں،جس کے مقدر میں بد نصیبی کے شگوفے ہی جنم لیتے رہے۔

اس کی زندگی ایک نوحہ خوانی ہے۔

پریشان شکست خوردہ روحانی ہے۔

اس کا اپنا کوئی ہمدرد نہیں۔

کوئی ہم راز نہیں۔

خوب صورت منزل کی تلاش میں راستے کی کٹھن، دشوار وانجان سفر پر رواں دواں ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ کا جھوٹا چولا سجائے۔ خاموش گزرتے وقت کے ساتھ وقت کے بہاؤ میں۔

خالص جذبوں کا حسن تو اسی میں ہے کہ کسی قسم کا اظہار نہ کیا جائے۔ لیکن وہ کبھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اک خواہش سر اٹھاتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ کسی دیوار کی چھاؤں میں اپنی آنکھیں موند لیں اور مضبوط کاندھوں پہ سر رکھ کے اطمینان کا سانس لیں۔

وہ اس نامعلوم منزل کے تعاقب میں چلتے ہوئے تھک چکی تھی۔ اس کے وجود کے سر میں کراہ، سسکیاں، چیخ و آہیں ہی سنائی دیتی ہیں۔

انسان کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اسے رونے کے لئے ایک کاندھے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ وہ اپنے کاندھوں پہ سر رکھ کے رو نہیں سکتا۔

ہر انسان کی جبلی جذبات ہوتی ہیں کہ کوئی تو پریشانیوں کے بدلے بہاروں کی طرح مسیحائی اور مہربان دوست کی طرح۔ اس کے ماتھے پر پیار بھرا ہاتھ رکھے۔

ایک اکیلی ذمہ داریوں کی گٹھری سر پہ لاد کر چلتے ہوئے اس کی کمر جھک گئی تھی اور درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔

اس کو بغیر کسی جرم کے سزائیں مل رہی تھیں وہ تو ان سب کی حقدار نہیں تھی۔ وہ تو ہر لڑکی کی طرح آنکھوں میں خوب صورت سپنے سجائے ہوا کا ہاتھ تھامے انجان سفر پر انجان ہم سفر کے ساتھ خوشبو کے اڑن کھٹولے پر سوار نکلی تھی۔ ہر نتیجے سے غافل لاپرواہ۔ وہ تو صرف محبت کا چہرہ دیکھی تھی لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ اس نے اندر کے خالی انسان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس کو کب اکیلے پن سے دوستی ہو گئی پتہ ہی نہیں چلا۔ ہاں کبھی کبھی اس کو اکیلے پن سے وحشت ہوتی لیکن نفرت نہیں۔ وہ تو اپنے اکیلے پن اپنے وجود سے پرے الہام تک پہنچتی جہاں اسے عشق کی لطافت کی آخری حدوں کو چھوتی ہے۔

لیکن وہ وہ اک سوال اپنے خیال حسن سے ضرور کرتی ہے کہ جس نے تخلیق محبت کی، وفائیں لٹائی، رفاقتیں بانٹی اس کے نصیب میں ذمہ داریوں کے اتنے پہاڑ کیوں ہیں ہر ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے یہی سوچتی کہ اس کے بعد سکون ملے گا۔ چین کی سانسیں ملے گی۔

ایک عورت اپنی محبت کے تمام پہلوؤں سے اپنے ہم سفر سے ایک جواب مانگتی ہے۔ سکھ دکھ، ذمہ داریاں مل کر نبھانے کے عمل کو ساتھ رہنا کہتے ہیں۔

کیا یکجا زندگی گزارنے کا مطلب ایک ساتھ رہنا ہوتا ہے؟

طوفانوں میں چراغ جلتے ہیں۔۔۔

شہر سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور شمال کی سمت ایک شاہراہ سمنٹ کی سڑک سے جڑتی ہے، سمنٹ کی سڑک ختم ہونے کے بعد چار کلومیٹر تک ایک کچا راستہ میرے گاؤں الیاس نگر کو جوڑتا ہے۔

دو پہاڑوں کے وسط میں واقع فطرت کی گونا گوں خوب صورتی، ہرے بھرے کھیت، پاس سے ندی بہتی ہوئی، آم امرود کے پیڑ چاروں اطراف، پہاڑوں سے بہتے آبشار، گاؤں کے بیچ کچھ کچے مکانوں میں سے ایک میرا بھی مکان تھا۔

میں اپنے شوہر سہیل، ساس، اور اپنے دو بچوں راجی اور ناجی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ہر گھر خوب صورت ہوتے ہیں، ''سلیقے سے سجا کر میں نے اور حسین بنایا۔''

کہتے ہیں کہ میں سادہ مزاج والی گھریلو، پڑھی لکھی خوب صورت خاتون ہوں۔ تب ہی تو گاؤں کی عورتیں مجھ سے چھوٹے موٹے حساب کتاب کرلیا کرتی تھیں۔ مجھے گھریلو کام کاج کے علاوہ کتابیں پڑھنے کا اور لکھنے کا شوق بھی ہے۔

ساس کو زیرلب بڑبڑاتے ہوئے اور شوہر کے ماتھے پر موجود لکیروں کو سکیڑتے اور پھیلتے دیکھ کر بھی خود کو گھریلو کاموں میں مشغول رکھنا میری عادت بن چکی تھی۔

میں نے اپنے بچوں کو بہترین تعلیم کے حصول کے لئے کافی جدو جہد کی، میرے سامنے پہاڑ جیسے چیلینجز تھے، لیکن وہ میرے خوابوں کے بیچ کبھی نہیں آئے۔

بھلے ہی سپنوں کو پورا کرنے کی چاہ میں، ''میرے وجود کی کرچیاں ہوتی رہیں''۔ ساس کا زیرلب بڑبڑانا، شوہر کے ماتھے کی لکیروں کا پھیلنا اور سکڑنا میری سمجھ سے بالاتر رہا۔

میرے گھنے بالوں کے بیچ گورا خوب صورت چہرہ، نرم و گداز جسم کو سہیل اپنی آنکھوں سے نہارتا رہا لیکن میرے باطن کا درد اس کو کبھی نظر نہیں آیا، وہ اس بات سے بے خبر تھا بالکل ویسے ہی جب کوئی چڑیا اپنی بھوک پیاس کے لئے دانہ پانی ڈھونڈ لیتی ہے لیکن دانوں کے باہر صیاد کے بچھائے جال سے بے خبر۔

پڑوس میں سہیل کی خالہ اپنی بارہ سالہ بیٹی ثمو کے ساتھ رہا کرتی تھیں، ثمو ہونہار، ذہین تھی، خالہ اکثر میرے گھر آیا کرتی اور بڑے مزے سے اپنی بیٹی کی ذہانت کے قصے سنایا کرتی اور کہتی کہ ثمو کو خوب پڑھا لکھا کر آئی اے ایس آفیسر بنانا ہے۔

بیوگی کی چادر اوڑھے اپنی اولاد کے لئے حسین خواب سجانا ''صرف ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔''

میں نے اپنے گزرے وقت کا حساب لگایا۔

اس وقت کے دوران بچپن کی یادیں، امی ابو کا لاڈ و پیار، بہن بھائی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی شرارتیں۔ بہت قیمتی سرمایہ تھی۔

اب میرے پاس تھا تو صرف ساس کی بڑبڑاہٹ، شوہر کا سپاٹ چہرہ اس کے اوپر

پیشانی کے آڑھے ترچھے بل۔ مجھے کبھی پتہ نہیں چلا کہ پیشانی کے بل کے پیچھے چھپی گہرائی۔

یہی میری تقدیر کا مستقل حصہ تھیں جس میں میری شخصیت کے کئی پہلو دب کے رہ گئے۔

ایک بے جان مسکراہٹ لمحہ بھر کے لئے میرے ہونٹوں سے پھوٹتی پھر معدوم ہو جاتی بے بسی۔مجبوری کی ملی جلی کیفیت

دن بھر کی تھکاوٹ کے باوجود شب کے آخری پہر کی دھڑکن میں ٹھہر جانا اور سوچنا کہ۔

کیا میری زندگی کا نصب العین یہی تھا؟

یکا یک آنسوڈھل کے میرے رخسار بھگونے لگتے،سانسوں کی گھٹن سے میرا دم گھٹنے لگتا،احساس محرومی کی شدّت سے میرے حلق میں گھٹتی چیخیں وہیں دم توڑنے لگتیں۔

اسی کشمکش میں احساس ہی نہیں رہتا کب نیند کی وادی میں کھوگئی، پھر صبح کے الارم کے شور نے چیخ چیخ کر جگایا،نماز فجر کی ادائیگی کے بعد دعا واستغفار پڑھتے ہوئے کچن کا رخ کرنا میرا روزآنہ کا معمول رہا۔

راحیلہ اُو راحیلہ! ابھی تک سوئی پڑی ہے کیا؟

چائے دوگی بھی کہ نہیں؟

ساس کی مسلسل آوازوں سے میرے اندر جیسے طوفان آ گیا۔

میں نے رات بھر کے خیالوں سے پھوٹنے والے انتشار سے خود کو آزاد کیا'' جیسے بارش کے بعد سارے پھول پتے مسکرا اٹھتے ہیں، کچن میں کود پڑتی ہوں جیسے کسی محاذ پر جانا ہے۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سارے کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے کام ایسے نپٹایا جاتا ہے جیسے کوئی قیدی قید سے آزادی چاہتا ہو۔

چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر ساس کی خدمت میں پیش کرنا کام کا پہلا اصول تھا، پھر سہیل اور بچوں کا ناشتہ اور ٹفن کی تیاری ہوتی۔ ناشتے کی پلیٹ لگاتے ہوئے پھر خیال آتا کہ ٹفن بھی پیک کرنی ہے۔

اس دھنگا مشتی میں یکا یک دایاں پیر کی چھوٹی انگلی میں درد کا احساس جاگا، میرے منہ سے ہلکی سی اک کراہ نکلی۔ پھر یاد آیا کل پھولوں کا گلدستہ پیر پر گرنے سے چھوٹی پیر کی انگلی زخمی ہوئی تھی۔

یا اللہ رحم، جھک کر اپنے پیروں سے چپل نکالی، زخم صاف کیا، تھوڑی دیر ہتھیلی سے دبا کے رکھا، درد کو سہلایا۔

پھر سے دوبارہ کام کاج میں جٹ گئی، ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

یہ ایک بار کا قصہ نہیں'' روز آنہ کا معمول ہوتا اور ہمیشہ ایسے ہی ہوتا۔''

پڑوسی خالہ بیوگی، لاچارگی کے قصے کہانیاں نئے سرے سے کہنا شروع کرتی، میں چلتے پھرتے ایک آدھ بات میرے کانوں میں پڑ جاتی۔۔۔اور کبھی خالہ مخاطب ہوتی'' اری او بدنصیب! کبھی بات بھی کر لیا کر، دل کا بوجھ ہلکا ہو جایا کرتا ہے۔''

تیری خاموشی تجھے کھا جائے گی۔

ہائے۔تو عورت ہے کہ مشین، ہمیشہ کام میں لگی رہتی ہے۔

خالہ کی آوازیں میرے کانوں میں سیسہ کی طرح پگھل پگھل کر اتر رہی تھیں۔

کبھی کبھی میں خدا سے شکوہ بھی کرلیا کرتی، اے خدا کیا میں ایسے ہی مرجاؤں گی ایک دن؟

مجھے اپنی قوم کے لئے ملت کے لئے کچھ کرنا ہے۔

میرے قلم میں اتنی طاقت دے کہ میری رسائی ہر انسان کے شعور تک ممکن ہو۔

میرے پاس تحفظ کے نام پر ایک چھت۔جس میں ہم پانچ لوگ اکھٹے رہا کرتے ہیں۔

ساس، سہیل، میں راجی اور ناجی

میں جب کبھی اپنی شخصیت کا جائزہ لیتی ہوں تو مجھے اپنی زندگی کے پہلوؤں میں سے کئی تجربے میری زندگی کے طوفانوں میں بھی چراغ بن کر جل اٹھتے ہیں، زندگی کی بساط پر میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، ہر نئی آزمائش کے ساتھ ایک نیا سبق سیکھنے ملا۔

''سبق میرے نزدیک ایک معجزہ سے کم نہیں تھا''

میں زندگی کے دکھ اپنے بدن پر جھیلتی رہی، جس کے عوض میری روح کو تقویت ملی، میں نے کسی سے بھی امیدیں لگانا چھوڑ دی، ہر حال میں صبر کا دامن تھام کر آگے بڑھتی رہی۔اپنی آرزؤں اور امیدوں کو سلا دیا، گو کہ میری زندگی کے اس پڑاؤ میں جتنا سفر کٹا بہت مشکل رہا، اب اتنا صبر آگیا ہے۔

نہ تو کچھ کھونے کا ڈرستا تا ہے۔

نہ تنہائی کا۔

نہ موت کا۔

میں نے صبر کے اس حقیقی احساس کو چھولیا جس میں کسی شخص کو اس بات کا ادراک نہیں ہوتا کہ وہ کبھی دیوانہ وار ہنسا نہیں۔

کوئی اسے پاگل پن کی حد تک محبت نہیں کی۔

بلکہ طمانیت ہوتی ہے۔

زندگی یکساں بس ایک سلسلہ۔

جہاں درد نہیں رستے

آہوں میں نہ کوئی شدّت

کسی سے محبت کی تمنائیں بھی جنم نہیں لیتی۔

آرزؤں کا خالی محل ہوتا ہے۔

پس! میں نے اول جھول خیالوں کے بجائے اچھی فکروں سے اپنے دماغ کو آباد رکھا۔

زندگی کو آسان با مقصد اور با اخلاق بنایا۔

میرا خیال ہے اگر زندگی میں صبر نہیں کیا جائے تو ہم کسی نہ کسی چیز کے غلام ضرور ہوتے ہیں۔

میری زندگی میں ایک وقت تھا

زوال کا

غربت کا

تکلیفوں اور آزمائشوں بھرا

حالات کی آندھیاں زوروں پر تھیں۔ میں ایک بے جان پتے کی طرح منتشر ہو رہی تھی۔ پھر میں نے طے کر لیا کہ مجھے بدستور اپنی جگہ پر طاقتور درخت کی طرح مضبوطی سے کھڑے ہونا ہے چاہے ہمدردیاں، محبتیں ساتھ ہوں یا نہیں۔

میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ کون میرے ساتھ کھڑا ہے میرے بارے میں کیا سوچتا ہے۔

خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے خود سے محبت کرنا شروع کر دی۔ خود کو سنبھالنا سیکھ لیا۔

بہتر سماج کی تعمیر۔۔۔

انسان ایک وسیع کائنات کا ایک ذرہ ہے لیکن قدرت نے انسان کو کاینات کے عظیم مقام پر رکھا اور کہا کہ قانون طبعی کو اپناتے ہوئے کائنات بنانے والے خالق کے ساتھ روحانی تعلق استوار کرلیں، جب مادی دنیا میں انسانی قوانین نافذ کئے گئے ہیں، تو ان اختیارات کا مطلب عمل سے ہے نہ کہ بے اختیاری، گمراہی و من مانی کی بے جا توسیع۔ صرف اخلاقی اپیل کے ذریعہ ہم بہتر سماج کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ہیں اس کے لئے ہم سب کو مل جل کر معاشی، سیاسی، اقتصادی و تعلیمی سرگرمیوں کا حصہ بننا چاہئے ان تمام سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کے لئے مختلف تنظیموں کا قیام عمل میں لائیں۔ ان تنظیموں کے ساتھ دیانتداری کے ساتھ جڑیں اور محنت کریں، اگر کوئی انسان ایک بہتر سماج کی تعمیر کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے لئے اس کے سامنے کئی چیلنجز ہوتے ہیں اور وہ دل میں درد لئے خاموشی اختیار کرتا ہے۔

اسی لئے یہاں ہر آدمی کو دوسرے آدمی کی ضرورت ہے، انسانی محنت میں اگر اجتماعی رنگ شامل ہو تو وہ شعور و فکر کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، اس طرح بہتر سماج کے لئے ایسی تنظیموں کا قیام ضروری ہے جو کہ قوانین کی روشنی میں کام کرے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر انسان شعوری طور پر ایسے ماحول کا عادی ہو جائے گا اور اس کی رسائی سماج

کی ارتقاء کی بلند ترین منزل ہوگی۔

عام طور پر انسان کے سماجی مسائل کا حل اجتماعی طور پر منحصر ہے، مثال کے طور پر اجتماعی ووٹ کے ذریعے اپنے لیڈر کا انتخاب کرنا ہے، دس بیس ووٹوں سے کوئی ملک کی باگ ڈور سنبھال نہیں سکتا، اس کے لئے اجتماعی اشتراک کی ضرورت ہے۔ ملک کی معاشی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی مقصدات اور قانونی تصورات کو بہتر ترتیب دیں اور بستیوں میں جا کر بتائیں کیا بہتر ہے اور کیا بہتر کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ووٹ کا استعمال کرنے کا حق اپنے پاس رکھیں اور صحیح استعمال کرنا چاہیئے۔

ان تمام پہلوؤں پر کام کرنا ضروری ہے۔ ہاں ان پر کام کرتے ہوئے نظریات کے درمیان مختلف اختلافات اور بعض اوقات ایک دوسرے کی تردید بھی ہوتی ہے، ہر کام کے لئے ایک ایجنڈے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی کے تحت کام کرنے کے لئے سمجھا یا جائے اور خوش مزاجی کے ساتھ اپنے حصے کا کام ایمان داری کے ساتھ کیا جائے ان تنظیموں کے نیک ارادے پر یقین کرتے ہوئے اس کی شکل کو تسلیم کرنا، اپنی ذاتی رائے کے بجائے سماج کی بھلائی کو سامنے رکھ کر گفتگو کریں۔

ان تنظیموں کے فکر کے اصول وقواعد کو باقاعدہ متعین کریں اور خلوص کے ساتھ حال و مستقبل کو سامنے رکھ کر جو اصول مرتب کئے ہیں ان کو اپنی اپنی قابلیت کے حساب سے کام کیا جائے اور سماج کی بہتری کے لئے بنائے گئے قوانین کو صحیح رخ پر چلایا جائے تو انسانیت کے لئے بے شمار فائدے کا سبب بنے گا۔

بظاہر یہ ایک خیالی نظریہ کہلاتا ہے لیکن درحقیقت ان ساری حکمت عملی پر اجتماعی توجہ کی ضرورت ہے جو کہ زندگی کے مسائل اور بہتر سماج کی بنیاد کے لئے پہلا پتھر ثابت ہوگا۔

کمبل کا بوجھ

دسمبر کی سرد رات میں شانوں پر کمبل اوڑھے سگار کے دھوئیں کے بگولوں کو نیم تاریک فضاء میں چھوڑتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم اللہ بخش خان اچانک چونک اٹھا، اسے محسوس ہوا کہ کوئی سایہ دروازے سے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، اس نے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا، آواز بھی حلق میں پھنس گئی، اس نے لپک کر بجلی جلائی سامنے سلمیٰ بیگم کھڑی تھی۔

کیوں چور کی طرح آئی ہو؟

اللہ بخش خان چلائے۔

جی! آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔

آج کل سلمیٰ بیگم اور اللہ بخش خان کے بیچ کم گفتگو ہوتی، ساتھ رہ کر بھی اجنبی کی طرح تھے، بس دو چار باتیں کبھی کبھار رسماً سی

اس کی وجہ اللہ بخش خان کی دوسری بیوی اسیہ خانم تھی۔

جب سے اللہ بخش خان نے دوسری شادی کر لی تھی سلمیٰ بیگم اور بیٹی مایرہ کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا تھا

سلمٰی!

اللہ رکھا خان نے چین کی سانس لی

اب آئی ہوتو بتا دو

مایرہ کے لئے، سلمی بیگم قدرے جھجکی!

اللہ رکھا خان نے سلمٰی بیگم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا!

مجھے رات دن ایک ہی فکر کھائے جارہی ہے، مایرہ نے جوانی کی پندرہ بہاریں دیکھ چکی ہے اب سولہ میں قدم رکھا ہے، اس نے قرآن مجید پڑھ لی اور دسویں جماعت بھی پاس کرلیا، مجھے لگتا ہے مایرہ کی شادی کی فکر کرنی چاہئے اتنا کہہ کر سلمٰی چپکی سادھ لی۔

اتنا کہنے کے لئے دن کا انتظار نہیں کرسکتی تھی؟

آپ کے پاس ہم ماں بیٹی کے لیے وقت کہاں ہے، سلمی نے طنز کیا

اللہ رکھا خان اپنی جگہ سٹپٹا گیا، پہلو بدل کر ہزیانی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے، دوسرا سگار ڈبیہ سے نکال کر سلگایا اور گہرے کش لینے لگا۔

ٹھیک ہے اب تم چلو۔

خاندان اور محلے کے جان پہچان میں مائرہ کے لئے شادی کی بات چلاتا ہوں، اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں موندلیں

سلمٰی بیگم دروازے کے کواڑ کو آہستہ سے بند کرتے ہوئے نیم جان قدموں سے باہر نکل گئی۔

''بیٹی شانوں پر پڑے کمبل کی طرح ہوتی ہے، گرمی کا احساس تو دیتی ہے لیکن

شانوں کو قدرے جھکا دیتی ہے۔''

جوں جوں مائرہ کی جوانی کے پھول کھلتے جا رہے تھے سلمیٰ بیگم کے سوکھتے جا رہے تھے، پڑوسی عورتیں آپس میں کھسر پھسر کرتیں، نوجوان بچوں کے دل اس کے ابھرتے نشیب و فراز، سڈول جسم حسین چہرے کی تپش میں پگھلتے جا رہے تھے۔

اللہ رکھا خان نے جب سے مایرہ کی شادی کی بات چلائی، اٹھتے بیٹھتے دولہے کی تلاش کی باتیں ہونے لگی، جب کبھی موقعہ ملتا خاندان کے محلے کی عورتیں و مرد اپنی اپنی تجویز پیش کرتے۔

ارے عادل کیسا رہے گا؟

نجمون! پاگل تو نہیں ہو گئی ہو، کہیں نفیسہ نے سن لیا تو کہرام مچا دے گی، امریکہ میں مقیم بیٹے کے لئے بڑے گھرانے کی بہو کی چاہ میں چلہ کر کے بیٹھی ہے، عادل کا امریکہ جانے والے پہلے دن سے آج تک نفیسہ نے تسبیح کو ہاتھ سے اترنے نہیں دیا، ہر دانے کے ساتھ جہیز کے نام کے دانے سرکتے ہیں، بس ایک ہی خواہش کنڈلی مار کے بیٹھی ہے کوئی پری جمال ڈھیروں جہیز کے ساتھ گھر میں قدم رکھے

''اور پھر مایرہ کو کیا کوئی لایق فائق نہیں مل سکتا۔''

لوگ بیٹوں کی شادی کے لئے بہترین کی چاہ میں عمریں بڑھا رہی ہیں، لڑکے بھلے چالیس پینتالیس کے کیوں نہ ہو جائے، صغری خالہ بولیں۔

اللہ خیر کرے، مائرہ کے سولہ سال نکل رہے ہیں، نومبر میں پورے سولہ مکمل ہو جائیں گے۔

نور جہاں پھپھو کا بیٹا بھی بڑا تھا، وہ اپنے نکمے کام چور بیٹے کے لئے مایرہ کے عمر کا حساب لگاتی اور ہمیشہ گنتی میں گھپلا کر کے بائیس بتانے لگتی، لہٰذا چاروں طرف سے مایرہ کی شادی کے لئے حملہ بازیاں ہو رہی تھیں، نور جہاں پھپھو فوراً بدر خالہ کی بیٹی سارہ کا ذکر چھیڑتی جس کا تذکرہ سلمیٰ بیگم کے لئے دکھتی رگ تھا، کیونکہ سارہ کی شادی جلد نہ کرنے پر عمر بڑھ گئی تھی جس کے نتیجے میں کسی رنڈوے کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔

''بڑی زور آزمایئاں ہوئیں، آخر کار دور کے رشتے کی بہن قمر خالہ کے بیٹے شعیب کے نام کا قرعہ نکلا''

شعیب چالیس سال سے ایک دن کا بھی زیادہ ہوا تو سو بد دعائیں، اللہ رکھا خان نے مائرہ کی ناؤ پار لگادی، اس کی سب سے بڑی وجہ اللہ رکھا خان کی غریبی، لاچارگی کا بوجھ تھا۔

مائرہ کی بے انتہا خوبصورتی کے باوجود مفلسی کے ترازو میں چالیس سال کے شعیب کا پلڑا جھک گیا، قمر خالہ نے اپنے بیٹے کو تیس سال کا بتایا تھا، سلمی بیگم کو ذرا سی تکلیف ہوئی لیکن چالیس سال کوئی جرم تو نہیں۔

''می! یہ تو بوڑھا ہے، مائرہ نے بوکھلا کر کہا۔''

میری جان! مرد کی مردانگی تو اسی سال بعد بھی قائم رہتی ہے، عورت ذات جلد بوڑھی ہو جاتی ہے، ایک دو بچے ہوئے نہیں کہ ساری رونق اتر گئی، سارا گداز پن ڈھیلا ہو جاتا ہے، پھر تم پچاس کی لگو گی اور شعیب ہٹا کٹا ہی رہے گا۔

مایرہ نے آنکھیں بند کر لیں، ایک سرد آہ اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ گھوڑے پر سوار اس کے سامنے سے نکل گیا، اور وہ تن تنہا خالی آنکھوں سے

اسے جاتے دیکھتی رہی۔

''مفلس کے خواب کہاں پورے ہوتے ہیں، وہ تو صرف آنکھوں مسیں آ کر ٹھیر جاتے ہیں۔''

کیا سوچ رہی ہو مایرہ؟

سلمیٰ بیگم کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی، سلمی بیگم نے شانوں کو جھنجھوڑا

ہاں امی!

بچپن سے سنتے آئے ہیں، مرد کی جوانی کو زنگ نہیں لگتا

لڑکیاں کہاں اپنی خواہش ظاہر کرنے کا حق رکھتی ہیں، وہ تو بیل کی طرح ہوتی ہیں، پہلے ماں باپ کے گھر میں کھونٹ سے باندھا جاتا ہے پھر کسی پرائے گھر، بہو اور بیوی کے نام پر۔

رضامندی نہ بھی ہو تو بیاہی جائے گی، ورنہ بے حیائی کا تمغہ ماتھے پر جڑ دیا جائے گا

امی جی!

ہوں۔

امی مجھے ذرا سی خوشی نہیں ہو رہی ہے، نہیں جانا ہے آپ کو چھوڑ کر۔

میں پڑھ لکھ کر خوب کماؤں گی، پھر ہم ساتھ بڑے مزے سے رہیں گے۔

کونسا پڑھ لکھ کر افسر بننا ہے، ایک نہ ایک دن چولہا چکی ہی چلانی ہے۔

تیرا باپ دوسری بیوی کے نشے سے باہر نہیں آتا، مسیں اکیلی جوان بیٹی کی

ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔

آخرکار ایک دن مایرہ شعیب کے ساتھ باندھ دی گئی، پلک جھپکتے کئی سال گذر گئے، مائرہ کے حسن میں رتی برابر فرق نہیں آیا، پہلے سے زیادہ جسم کے پور پور سے نور نکلتا، ایسی شعاعیں کہ شعیب اپنا دل نکال کر مائرہ کے قدموں میں ڈال دیتا، مایرہ دل و دماغ پر راج کرنے لگی، شادی کے پورے بیس سال بعد مایرہ چھتیس کی ہوگئ، لیکن حسن کو گہن نہیں لگا، چاند کی طرح دمکتا چہرہ، چاندنی میں نہایا جسم، کمر تک لمبی جھولتی چوٹی کی جگہ شانوں تک بکھرتے گھنے بال، حسن اور نکھر گیا۔

شعیب ذرا بدل گیا، پورے ساٹھ سال کا ہوگیا، تو ندآگے نکل گئی، بالوں میں سفیدی اور داڑھی میں بھی چاندی کے تار جھانکنے لگے، رخسار نیچے کی طرف لٹک کر جھول رہے تھے، آنکھوں پر موٹا نمبر کا چشمہ چڑھ گیا، غرض عمارت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی تھیں۔

مایرہ شادی کے بیس سال گزرنے کے باوجود حسین تر ہوگئی تھی، شعیب کے بدن کی صحت گرتی جارہی تھی، پیروں میں درد تو تھا ہی، بدہضمی بھی الگ عذاب جان، نئی نئی بیماریاں اور دواؤں کا دور شروع ہوگیا۔

شعیب پر بڑھاپا ٹوٹ پڑا، مایرہ کے حسن میں اور اضافہ ہوتا گیا

شلوار قمیض میں دھان پان طرح، شعیب کو مائرہ کے حسن سے چڑ ہونے لگی، کبھی گھنٹوں حسن کے قصیدے پڑھتے تھکتا نہیں تھا، اب اس کا پہننا، اوڑھنا کھانا پینا، حتی کہ اٹھنا بیٹھنا بھی چبھنے لگا

دن رات یوں ہی گزرتے رہے،شعیب کی زندگی میں ایک ایسی خاموش رات آئی،وہ چاہ کربھی اٹھ نہیں سکا۔ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گیا۔

مایرہ کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی اور دونوں بچے تھے،سسرال والے بھی شعیب کی موت کے بعد آنکھیں پھیر لیئے،جائیداد میں سے بچوں کا حق بھی ہڑپ لیا۔

دوبارہ واپس لوٹ کر باپ کے گھر کی چار دیواری میں قدم رکھا۔

''وہی پرانی دیواریں،کمرے کی بوسیدہ چھت،دیوار میں لٹکتا ٹوٹا آئینہ،کونے میں چارپائی پر ایک ناتواں لاغر جسم،یاس بھرا چہرہ،آنکھیں حصاروں میں دھنسی ہوئی زندگی سے مایوس،لاچار،بےکار،نہ بولنے کی ہمت تھی اور نہ ہی بیوہ بیٹی اور اس کے دو بچوں سمیت کفالت کرنے کی حیثیت،باپ مر چکا تھا،سوتیلی ماں ناگن کی طرح دندناتی ہوئی۔

یا اللہ رحم۔۔۔

مایرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔

مایرہ کا دل ٹوٹا مگر ہمت نہیں ٹوٹی اس نے بیاگ اٹھایا،آٹو ڈرائیور سے بات کیا اور شہر کے ایک ایوننگ کالج کا رخ کیا۔

مایرہ نے ایک عہد لیا،دن میں کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے اپنا امی اور بچوں کی ذمے داری اٹھائے گی،اور شام میں ایوننگ کالج سے اپنی تعلیم بھی جاری رکھے گی۔

''نازک سی مایرہ لیکن فولاد سے زیادہ سخت ارادوں والی،بےخوف''

زندگی میں کچھ واقعات،حادثات پیش آتے ہیں،ان سے بھاگ نہیں سکتے،بہتر ہے آنکھیں ملا کر مقابلہ کریں۔ بلند حوصلوں اور ہمتوں کے ساتھ۔

عورت کی کہانی

کہتے ہیں کہ ہماری تخلیق کا اصل مقصد حقوق العباد اور اس کے ساتھ فرائض کی ادائیگی ہے۔قدرتی طور پر انسان کائنات کے درمیان تعلق کو دریافت کرے اور اپنا رشتہ قائم کرے۔ ''حالانکہ انسان اور کائنات خدا کی تخلیق ہیں''۔انسان کی تخلیق میں عورت اور مرد دونوں الگ جنس کی شکل میں موجود ہیں۔

''عورت قدرت کی خوبصورت تخلیق کا نام ہے۔''

خواتین اس جہاں میں کئی اہم رشتوں سے جڑتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا خوب جانتی ہیں۔ ہر قدم پر ایک نیا امتحان حائل ہوتا ہے۔جس کو بحسن خوبی انجام دیتی ہیں۔اس کی زندگی کے شب وروز میں بعض لمحات بڑے صبر آزما ہوتے ہیں اس وقت لاچارگی مجبوریوں کا ٹھاٹھیں مارتا دریا کا رخ بھی موڑنا جانتی ہیں۔ بھلے وقت کتنا بھی مشکل و کٹھن رہے۔ لیکن ہمت وحوصلے سے کام لیتے ہوئے احساس کی بلندیوں سوچ وفکر کی گہرائیوں تک لے جاتی ہیں۔

اس کمرشل دور میں دولت کے دلدل میں ڈوبے ہوئے لوگ خواتین کے پیروکار بننا ہر لحاظ سے سودمند سمجھتے ہیں۔

خواتین کی تشہیر تضحیک وتذلیل کرنا ان کے کارے غصب کے ساتھ کارے ادب بن گیا ہے۔لیکن چند ہمہ جہت شخصیتوں کا ایک اہم روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے عام مرد کے ڈھکوسلے سے نکل کر عورت کی تعمیر وترقی کی تکمیل کے لیے ایک منظم تحریک چلا رہے ہیں۔

اور وہ اصحاب عورت کے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ان کے سامنے آنے والے نتائج

عورت کے چیلنجز

ان کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے معاشرے میں ایک خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔

معاشرے کی بدلتی قدروں پر غور وفکر کرنا۔

ذہانت وہ فراست کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی آج خواتین ایک عظیم طاقت بن کر ابھری ہیں۔

''جو کسی بھی انقلاب کا باعث ہوسکتی ہیں''۔

اگر ہم دیہاتوں کا رخ کرتے ہیں تو آج بھی وہاں عورتیں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کررہی ہیں۔تعمیری سوچ اور معاشرے کی تخلیق کو سمجھ نہیں پارہی ہیں۔خود کو کمتر سمجھ کر مردوں کے رحم وکرم پر بڑی بےبس ولاچار ہیں۔حالانکہ یہ انقلابی دور میں ان خواتین کی ذہنوں کے بگاڑ کا باعث ہے۔یہ ایک مہلک مرض ہے جس میں عورتیں خود کو تخلیقی سرگرمیوں سے دور رکھے ہیں۔

دیہاتوں میں لڑکیاں چودہ پندرہ سال کی عمر میں بیاہی جاتی ہیں۔سسرال اورشوہر کی خدمت کواوالین فرض سمجھ کرخود کوجسمانی اذیت سے دو چار کرتے ہوئے روحانی سکون سے دور ہوتی جاتی ہیں۔ بچے پیدا کرناان کی پرورش کرنا ہی ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ کئی دفعہ خود کے اندر پنپنے والی اندرونی بیماریوں سے اکیلی لڑتے ہوئے چھوٹی عمروں میں مر بھی جاتی ہیں۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک مردوں کا عورتوں پر تسلط رہا۔ اس دور کا 90 فیصد عرصہ مردوں کی جارحیت پر محیط رہا۔ عورتوں پر ظلم کی کہانی سونگھ کر آج کئی قلمکاروں نے اپنی عقابی ومتلاشی آنکھوں سے دنیا کو باخبر کیا۔ اور یوں یہ خبروں میں بیچاری کی تفصیل میں نمبرون پر رہی۔

آج ہم کووقت آواز دے رہا ہے۔عورتوں کو کمتر سمجھنے تک محدود نہ رہیں۔

بدلتے دور کے ساتھ عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی میں بھی بدلاؤ کی ضرورت ہے۔اگرعورتیں سیاست میں قدم جمارہی ہیں۔مذہبی برابری کے لیے لڑرہی ہیں۔اپنے اوپر ہونے والے ظلم وزیادتی پرآواز اٹھارہی ہیں۔جدید موضوعات پراپنا قلم چلارہی ہیں۔کئی مقصدی اوراصلاحی ادب کی آبیاری کررہی ہیں۔تو آپ اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے میں تعاون کریں۔حوصلہ بنیں۔آواز بنیں۔

بیوہ کی چادر

سورج کی ڈھلتی ہوئی سنہری کرنوں نے شام کا اعلان کیا، دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی، بے کیف سی شام، نہ جانے سمیرا کا دل کیوں بوجھل سا تھا، عجیب سی گھبراہٹ رہ رہ کر خوف زدہ کر رہی تھی۔ اندر ہال میں بیٹھی زبیدہ بیگم مغرب کی اذان کے انتظار میں بیٹھی تسبیح کے دانے گن رہی تھیں۔

تب ہی مین گیٹ کی کال بیل بجنے لگی، صحن میں بیٹھی سمیرا نے دروازہ کھولا، تب ہی جاوید کے دوست شاہد ایک بری خبر لے کر آئے، جاوید کا ایکسیڈینٹ ہو گیا اور وہ بری طرح زخمی ہوا تھا، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اسپتال کے راستے میں ہی جان دے دی۔

''سمیرا کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔''

ارشد میاں کو پتہ چلا تو وہ بھی مسجد سے دوڑے دوڑے گھر پہونچے، سارا گھر ماتم کدہ بن گیا، سمیرا بار بار بے ہوش ہوئے جا رہی تھی۔

سمیرا کے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی، اچھا بھلا، صحت مند نوجوان اپنی خوبصورت نازک کم عمر بیوی اور اپنے دو بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا، معمول کے

مطابق اپنی بائیک نکالی اور آفس جانے کے لیے نکلا۔ اس کا روز کا معمول تھا، جانے سے پہلے اپنی بیوی کو آئی لو یو(I Love You) کہنا، کسے معلوم تھا کہ آج وہ آخری بار اپنی سمیرا کو گلے لگا کر پیشانی پر بوسہ دے کر I Love You کہہ رہا ہے۔

سمیرا ٹوکتی ’ آپ تو ہمیشہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں میرے پاس میرے قریب رہنے کے لیے۔‘‘

اتنی خوب صورت جوان بیوی ہو تو کس کا دل چاہے گا کہ دور جائیں۔ اگر میرا بس چلے تو یوں ہی تمہارے ساتھ ہمیشہ رہوں، ایک پل کے لیے دور نہ ہوں۔

’’کمبخت پاپی پیٹ کا سوال ہے۔‘‘ کہتے ہوئے ایک شوخی بھری بائے کہتے ہوئے اپنے دل پر ہاتھ رکھتا۔

نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جس کی زد میں دو بچے ننھی سی پری مریم اور معصوم ابراہیم اور جوان بیوی سمیرا کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ زینب خالہ نے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

تیز رفتار ٹرک کے سامنے جاوید خود کو سنبھال نہیں پایا اور تصادم اتنا خطرناک تھا کہ جیتا جاگتا انسان موت کی آغوش میں کھو گیا۔ پڑوس کے چمن خالو نے درد بھری آواز سے بپتا سنائی۔

امنگوں، آرزوؤں بھرے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں، خوب صورت خوابوں کے تانے بانے بننے والی آنکھیں ساکت ہو کر رہ گئیں۔

جاوید کی نعش دیکھ کر بوڑھے والدین، سمیرا، مریم اور ابراہیم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

دوست، احباب، رشتے داروں تک خبر پہونچ گئی۔ ہر ایک کی زبان سے بڑی اچھی اچھی باتیں جاوید کے لیے نکل رہی تھیں۔ کوئی کہتا اچھا بھلا تھا، صبح آفس جاتے ہوئے بات ہوئی تھی، تو کوئی کہتا کل ہی ریستوراں میں دوستوں کے ساتھ کافی گپ شپ اور چائے کا دور چلا تھا۔ ہر ایک پر قہر ٹوٹ پڑا تھا، کسی کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جاوید اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

''سمیرا کو بار بار بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔''

اس کے کانوں میں جاوید کی I Love You کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے کانوں کو زور سے اپنی ہتھیلیوں سے بند کرلیا، آئی لو یوٹو جاوید کہتی ہوئی زور زور سے چیختی رہی۔ اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی بکھر کر رہ گئی، اس کے دو معصوم بچے یتیم ہو گئے۔ وہ بیوہ ہوگئی۔ اتنا کربناک انجام اس نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جاوید کی ایک ایک بات تڑپا رہی تھی۔ بیتے لمحوں کی کسک رلا رہی تھی۔

جاوید کے بغیر ساری زندگی اکیلے کاٹنے کا تصور ہی خوفناک تھا لیکن قدرت کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔

جیسے جیسے سمیرا نے خود کو سمیٹا، اس کے سامنے دونوں بچوں کا مستقبل تھا، وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔

ماں باپ پر سمیرا تینوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے ایک کمرے والا کرایے کا مکان لیا، ایک پرائیویٹ فرم میں چھوٹی سی نوکری ڈھونڈھ لی۔

سمیرا بڑی خوددار تھی، اپنے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری نبھا رہی بیوگی کی گرد نے

سمیرا کے چہرے پر اپنے نشان دکھانے شروع کر دیے، معصوم سی نازک خوبصورت سمیرا کا چہرہ زرد ہو گیا، ہونٹوں پر پپڑی جم گئی، آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو گئے، لیکن جوان جسم تر و تازہ تھا۔ کمبخت کہیں سے بھی کوئی جھول نہیں، آس پاس کے مردوں کی رال ٹپکنے لگی، بھوکی ننگی نگاہیں اس کے جسم کے آر پار محسوس ہوتیں۔

کئی بوڑھی عورتوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، پہلے پہلے سمیرا کو بہت بڑا لگتا تھا لیکن زمانے کے تھپیڑوں سے وہ بھی تھک چکی تھی۔ اسے بھوک پیاس نہیں ستاتی تھی، صرف ایک سہارا چاہیے تھا جس کے اندر وہ اپنی جوانی کو چھپانا چاہتی تھی۔

جب اس نے دوسری شادی کے لیے حامی بھری تو ماں باپ عزت کا واسطہ دینے لگے۔ دو بچوں کی ماں دوسری شادی کرے گی تو ہماری ناک کٹ جائے گی اور کیا دوسرا آدمی تمہارے بچوں کو اپنائے گا۔

ساس سسرا الگ سے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی دہائی دیتے، جاوید کی نشانیاں ہمیں دے دو، کہیں بھی شادی کرلو۔

ہائے رے دکھ

ایک بیوہ کی مجبوری

اور سماج کی غیر ضروری رکاوٹیں

''سماج کو کون سمجھائے، بیوہ ہونا یا طلاق شدہ ہونا کوئی جرم نہیں۔''

ایک طلاق شدہ عورت ہو یا بیوہ، سماج کی ذمہ داری ہے سنت پر چلتے ہوئے دوسری شادی کی اجازت بخوشی دیں اور ایک عورت کو سر اٹھا کر عزت سے جینے کا موقعہ دیں۔

بہار آنے تک

یہ جاڑوں کی خوبصورت صبح، سورج کی شعاعوں سے کھیلتی نرم و نازک ہریالی، آم، امرود اور شہتوت کے پیڑوں پر پرندوں کا چہچہانا، سبزہ، چمن، لالہ و گل پر بہار کی نشانیوں کا یقین، چاروں طرف ناچتے ہوئے شریر ہوا کے جھونکے میرے گالوں کو چھو کر گذرتی ہوئی الھڑ دوشیزہ ہوائیں، سنہری گھاس پر ٹہلتے ہوئے میرے دماغ میں بہت ساری باتیں رقص کر رہی تھیں۔۔۔۔۔

''میری زندگی کے دس سالوں پر عامر کی محبت کا قبضہ رہا۔''

خوبصورت موسم بدلتے رہے لیکن کبھی بہاریں ختم نہ ہوئیں، گواہ ہے ہماری محبت کے یہ انجینئر نگ کالج کی سبزہ زار راہیں، کیمپس کی رونقیں، اسی کے دامن میں آم، امرود، شہتوت وغیرہ کے پیڑ، خوشبو بکھیرتی پھولوں کی بیلیں، یہ صاف شفاف نیلگوں پانی کا چشمہ

آہ! دلوں میں اڈتی سرسراہٹیں۔۔میرے دل کے دریچوں سے گزرتے رہے۔

ہر سیمسٹر کے آخری دن میں اور عامر پھولوں سے لدی بیلوں کے پیچھے چھپ جایا کرتے تھے۔۔۔ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھٹنوں پانی کے چشمے میں پیروں کو چھوڑ

کر مستقبل کے حسین سپنے سجایا کرتے تھے

آخری سال کے آخری سمسٹر کے دن ہم دونوں نے بہت ساری باتیں کیں، کئی وعدے، قسمیں اور عہد لے کر اٹھے

نوکری کی تلاش میں عامر نے دوسرے شہر کی راہ لی، اس دن میرا رو رو کر برا حال ہو گیا، عامر نے دلاسہ دیا کہ وہ بہت جلد اس کے امی ابو سے ہماری شادی کی بات کرے گا

''ہر انسان کو محبت سے زیادہ روٹی کی ضرروت ہوتی ہے۔''

لیکن میری زندگی پر اداسیاں سی چھائی جا رہی ہیں، شائد بدلتے موسم کا مزاج۔۔۔ گرم ہوائیں چل رہیں ہیں۔۔۔ دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہو گیں، درختوں کی ننگی ٹہنیاں، خاموش سوگوار سڑکیں، سوکھے اور پیلے پتوں کا زمیں پر انبار۔۔۔ یہ صحرائی ہواؤں کے تھپیڑوں سے گال جلنے لگے تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔۔۔ نہ معلوم بارشیں کب آئیں گی۔

نرگس میری خاص دوست نے مجھے ایک دن اپنے گھر بلایا۔۔۔ کہنے لگی

فوزیہ تم بہت فلاسفر ہو گئ ہو یار۔۔۔

کیا رومی کو بہت پڑھ لیا؟

یار فلسفے کے آگے بھی ایک دنیا ہے۔۔۔

سپنوں کو پورا کرنے کا مقصد۔۔۔

ایسے سپنے، جہاں انسانیت کی خدمت کی جائے۔۔۔

ٹھیک ہے نا۔۔۔

میری باتیں نرگس کو کیوں فلسفیانہ لگتی تھیں، معلوم نہیں۔۔۔

میں تو عام لڑکی کی طرح ہی سوچتی ہوں

پچھلے جون کی ایک شام عامر نے مجھے سینما دکھانے لے گیا، مجھے فلم میں رتی برابر دلچسپی نہیں۔۔۔ میں تو صرف عامر کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ عامر کا بازو تھامے، آنکھیں بند کیے اس کی رفاقت کی آگ میں تپ رہی تھی، دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں ایسے لگتا تھا سینہ چیر کر کہیں باہر نہ آجائے۔ پھر عامر کی آواز سے مجھے ہوش آیا۔

کہہ رہا تھا کہ رات کا کھانا کسی اچھے ریستوران میں کھالیں۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔

کھانے کی میز پر عامر نے کہا کہ میں بہت جذباتی لڑکی ہوں۔

چند دنوں تک ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ کمی آتی گئی۔ شاید عامر کی جاب اور چھٹیاں بہت دنوں کے بعد ہم دونوں کافی ہاؤس میں ملے۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ عامر کچھ بدلا بدلا لگا۔ میں محبت، جدائی اور تڑپ کی باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ بڑی فلسفیانہ باتیں کہہ رہا تھا۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یا میں سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

آخر میں نے کہہ دیا کہ عامر آج آپ بڑے فلسفی لگ رہے ہو، شاید آپ پر رومی، جبران کا جادو چل گیا۔

میرے پاس رومی یا جبران کی کوئی کتاب نہیں۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا

''تو آپ نے فون میں پڑھا ہوگا۔''

میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔

ہائے بے چارہ۔۔۔

میں نے ایک آنکھ دبا کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عامر نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

ہم دونوں نے بہت اچھا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔

کبھی ہم نے اپنی حدیں پار نہیں کی۔

ہماری محبت پاکیزہ تھی۔اوس کی بوندوں کی طرح۔اس کی یہی عادت مجھے دیوانہ بنا گئی۔

اس کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔میرا دل چاہتا تھا گھنٹوں اسی کو سنتی رہوں۔ اس کے نزدیک کسی مایوسی کو پھٹکنے نہ دوں۔اس کے پاس آنے والے ان چاہے لمحات کو اتنی زور سے ٹھوکر لگاؤں کہ وہ لڑ کھتے ہوئے کسی دوسری دنیا میں گم ہو جائے۔سب کچھ اچھا اچھا ہو جائے۔

لیکن اب عامر شہر سے کم آنے لگا کئی بار میں نے کریدنے کی کوشش کی۔کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

پتہ نہیں کیوں؟

آج کل ہماری ملاقاتیں بند ہوگئیں اور فون کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

ایک دن میں چاچا زاد بہن کے داخلے کے سلسلے میں میرے کالج گئی تو بہت ساری

یادیں میرے پردہ ذہن پر فلم کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ پھر اچانک میرے قدم راہداری سے ہوتے ہوئے کالج کے کافی ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔ کافی ہاوس کے پیچھے حصے میں گارڈن اور اسی میں پانی کا چشمہ اپنی شفافیت کے ساتھ موجود تھا۔

اس چشمہ کے پاس ہمارا بہت زیادہ وقت گذرا تھا بہت سی یادیں وعدے وابستہ تھیں۔ مجھے بہت سکون دیتا تھا چشمہ کا پانی۔ میں اکثر پانی میں دیکھ کر خود کو سنوارا بھی کرتی تھی۔

وہیں بیٹھ گئی، یکا یک میرے پاؤں پانی کی سطح کو چھونے لگے۔ پھر میں پانی کی بوندوں میں خود کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

دل بے چین ہو گیا۔

درد کی ٹھیس روح کو زخمی کرنے لگی۔

پھر مجھے پانی کی سطح پر ایک سایہ لہراتا دکھائی دیا جو جانا پہچانا تھا۔ میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

عامر۔۔۔

نہیں۔۔۔

یہ عامر کا ہی سایہ تھا۔۔۔

یا خدا۔۔۔

کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔۔۔

یقیں وگماں کے بیچ غوطہ کھاتی رہی۔۔۔

پھر سر جھٹک دیا۔۔۔

نہیں یہ میرا وہم تھا۔۔۔

بھلا عامر کالج کیوں آئے گا؟

اگر کچھ کام رہا تو مجھے ضرور بتاتا۔۔۔

شاید میرا خیال تھا۔۔۔میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔۔۔اسی تانے بانے میں الجھی تھی کہ۔

اچانک ایک زناٹے سے راہداری کے پھولوں کو کچلتی ہوئی کالی لمبی کار میرے سامنے سے نکلی۔میری آنکھیں دم بخود رہ گئیں۔

ڈرائیونگ سیٹ پر عامر کالا چشمہ آنکھوں پر لگائے لیدر کی جیکٹ کے کالر اوپر چڑھائے بازو سیٹ پر بیٹھی کسی خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بہت پیار سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ لڑکی کوئی اور نہیں نرگس میری دوست تھی۔۔۔

چھناکے سے میرا دل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔۔۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔۔۔ہاتھ پیر سرد ہو گئے، حلق میں کانٹے پڑ گئے۔۔۔میں چاہ کر بھی اسے آواز نہ دے سکی۔۔۔

وہ چلا گیا۔۔۔

مجھے چھوڑ کر۔۔۔

مجھے دھوکہ دے گیا۔۔۔

تنہا کر گیا۔۔۔

اور پھر میری زندگی میں خزاں آ کر ٹھہر گئی۔ عامر کی کار کے پیچھے رہ گئی اس سڑک کو خاموش دیکھ رہی تھی۔ راہداری کے زرد پھول پتے اڑ کر میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے تھے۔

گرم ہواؤں کے ساتھ اڑ کر آتے اور جاتے رہے۔

میں بوجھل قدموں سے گھر کی راہ لی۔ مجھے ہر طرف خاموشیوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک لامتناہی سفر۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔

اے دل پر راج کرنے والے انسان۔

میں تجھ کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔

یہ کیمپس۔

یہ راہداری۔

یہ کافی ہاؤس۔

یہ پانی کا چشمہ۔

ہماری محبت کا گواہ ہے۔

میں انتظار کروں گی۔

اے آدمی۔

موسم بہار تک۔

شاید یہ موسم بہار کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

کوکھ کا درد

مین گیٹ کے باہر گاڑی کے مسلسل ہارن سے میری آنکھیں کھل گئیں، نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے وقت کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن کمرے کی آدھی تاریکی اور نیند سے بوجھل آنکھوں سے دیکھ نہیں پائی۔ یہی کوئی رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

اف، بادل نخواستہ بستر سے اٹھی، چادر ٹھیک کی اور دوپٹہ سنبھالتے ہوئے تیز قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف بڑھی۔۔ گیٹ کھولا تو شرجیل گاڑی پر بیٹھا اپنا بایاں ہاتھ ہارن پر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر مجھ پر ڈالی اور گاڑی پارک کر سیدھے بیڈروم میں گیا اور بیڈ پر دھم سے گر پڑا۔ میں بیڈ کے کنارے ایک نیم دراز کرسی پر بیٹھ کر یک ٹک شرجیل کو دیکھے جارہی تھی وہ بے سدھ ہو کر پورے بیڈ پر آڑھا ترچھا ہاتھ پیر پھیلائے سو رہا تھا مجھ سے لاتعلق۔ جیسے مجھے جانتا ہی نہیں۔ پھر آنسوؤں کی ایسی لڑی نکلی کہ میرے رخسار بھگوتے ہوئے گلا بھگونے لگی۔

شاذیہ کو اپنی بدنصیبی پر بہت رونا آیا۔ کرسی کا بازو تھامے اس کی پشت پر ٹیک لگا کر پیروں کو قدرے سیدھا کیا اور آنکھیں میچ کر خیالوں کے جال میں الجھتی رہی، کئی

خیالات میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ پھر میرے سامنے ماضی کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے، یکے بعد دیگرے ورق پلٹتے رہے۔ پندرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول ٹاپ کیا سارے ڈسٹرکٹ میں پہلی پوزیشن پر پہونچنے والی پہلی لڑکی تھی۔

مبارکباد دینے پڑوس کے لوگ دوست احباب آتے رہے اس طرح سارا دن گزر گیا۔ امی ابو اور بہن بھائی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ابو نے گلے سے لگا لیا امی نے ماتھا چوما پھر گلے لگا کر دونوں نے ڈھیروں دعائیں دیں۔

اسی سال گاؤں کے کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ دلا دیا گیا۔ گاوں کا کالج کیا تھا۔ لڑکیاں پورے حجاب میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی تھیں، ہر کلاس کے لئے لڑکیوں کو بلایا جاتا کہ کون سے بلاک کے کس روم میں کلاس ہے۔ کسی وقت کلاس نہ رہی تو لڑکیوں کے لئے علیحدہ روم ہوتا۔ اسی بنیاد پر مخلوط کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ میرا دوسرا بیچ تھا۔

ساذیہ نے انٹرمیڈیٹ اچھے نمبرات سے پاس کیا، میرے سامنے اونچے خواب تھے، ہمیشہ آرزو رہی پوسٹ گریجویشن کے بعد علامہ اقبال کی شاعری پر تھیسیس لکھوں۔ ایک اسکالر کے روپ میں خود کو دیکھتی۔

ساذیہ کو شاعری کے شوق کے ساتھ کہانیاں لکھنا اور اچھی معیاری کتابوں کا مطالعہ میرے والد صاحب کے ذوق کی وجہ سے وراثت میں ملا تھا۔ پڑوس کی خالہ جب بھی ہمارے گھر آتی تھیں، آتے ہی اچھے رشتوں کی لسٹ گنوایا کرتیں کہ فلاں ڈاکٹر کا رشتہ میں نے ہی لگایا فلاں آرمی آفیسر کا۔ اے شاذیہ کی امی! اب شاذیہ بھی جوان ہو چکی

ہے۔کیا شادی وادی کرنی ہے کہ نہیں؟

خالہ امی سے مخاطب ہوتیں۔لڑکیاں ایسی بڑھتی چلی جاتی ہیں جیسے کوئی بیل ہو۔ دوسرا شوشہ چھوڑا۔ابھی کب بیاہ کروگی؟

امی کے ہونٹوں سے ہلکی سی مسکراہٹ پھوٹتی۔جب سہرے کے پھول کھلیں گے۔ کہتے ہوئے امی خالہ کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھماتیں۔

رمضان خان کا بیٹا شرجیل ہماری شاذیہ کے لئے کیسا رہے گا؟ کہو تو بات چلاؤں۔

امی کو ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن ابو نے کان کھڑے کر لیے۔ارے وہ لوگ کہاں اور ہم کہاں۔بھلے ہمارے ہاں وہ رشتہ کیوں کریں گے؟ابو نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

مالی طور پر مستحکم،ذاتی گھر،کار،ہینڈسم بیٹے کے لئے کوئی بڑے گھرانے میں رشتہ کریں گے۔

میں ابھی گریجویشن کے دوسرے سال میں تھی۔انیس لگے تھے۔ابھی شادی کے بندھن سے آزادی چاہتی تھی۔میرے سامنے کئی سپنے تھے۔اس کو پورا کرنا مقصد العین تھا لیکن شرجیل کی دولت کی چکاچوند میں مجھ کو ڈال دیا گیا۔ آخر کار میں نے شرجیل کی دلہن کے روپ میں اس کے گھر میں قدم رکھا۔

ہرلڑکی کی طرح بہت سے حسین خواب سجائے۔خواب بھی ایسے کہ اپنا سب کچھ لٹا کر توجہ،تحفظ عزت اور چند محبت کے لمحوں کے بدلے۔شادی کے دو ماہ ایسے گزرے جیسے پر لگ گئے ہوں۔ہم دونوں ایک دوسرے کی قربت میں سرشار تھے،میری

زندگی شرجیل کا بازو تھامے اس کے ساتھ اس کے سہارے چلتی رہی۔ بہت خوبصورت تھے دن رات۔

ایک دن ہوا یوں کہ شرجیل نے گھر لوٹنے میں دیر کر دی۔ میں شرجیل کے انتظار میں بے چین و بے قرار ہوتی رہی۔ رہ رہ کر عجیب خیالات و وسوسے ڈس رہے تھے۔ اچانک بیڈ روم میں ایک آہٹ اور ایک ہیولہ دکھائی دیا۔ میری سانسوں کا زیر و بم بڑھنے لگا، حلق سے چیخ نکل ہی رہی تھی کہ ایک آن میں وہ سایہ میرے بازوؤں میں جھول گیا۔

افف یہ تو شرجیل تھا۔ میرے خدا، آپ نے تو ڈرا ہی دیا اور یہ کیا شرجیل۔ آپ کے منہ سے بد بو آ رہی ہے۔ آپ نے شراب پی رکھی ہے۔

شرجیل آنکھیں چراتے ہوئے۔ یار دوستوں نے زبردستی تھوڑی پلا دی۔

منع کیوں نہیں کیا؟

غلطی ہو گئی جان!

اس نے میرے زانوں پر اپنا سر رکھ دیا، پھر گہری نیند میں کھو گیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ساری رات انتظار کی شمع کو بجھنے نہیں دیا، لو کی حفاظت کرتی رہی۔ وہ گھڑیاں ختم ہوئیں لیکن میرے ارمانوں کا دیا بجھ گیا۔ دل ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ہر روز شرجیل کسی نہ کسی بہانے شراب پی کر گھر دیر سے لوٹنے لگا۔ یہ روز کا معمول ہو گیا۔ میں ایک تماشائی کی طرح دیکھتی چپ چاپ سہتی رہی۔ بہت کٹھن وقت تھا۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ حتیٰ کہ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں۔ کیا کہتی کہ بڑے گھرانے کا

خوب صورت داماد روز شراب کے نشے میں دھت ہو کر آتا ہے۔ ماں باپ کی کمر ٹوٹ جاتی۔ دوسری بہنیں باپ کی دہلیز پر تھیں۔ اکلوتا بھائی روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

اوسط گھرانے میں پلی بڑھی شاذیہ اپنے ساتھ دینی تربیت، مزاج میں نرمی اور ٹھیراؤ لے کر آئی تھی۔ شرجیل کے رویہ سے میری ہمتیں ٹوٹ رہی تھیں لیکن بدستور رسم وفا نبھاتی رہی۔

ایک دن میری طبیعت کافی خراب ہوئی، متلی اور قئے کی وجہ سے نڈھال ہوگئی، چہرہ پیلا پڑ گیا۔ شرجیل مجھے لیڈی ڈاکٹر ام ہانی کے پاس لے گیا۔ ٹسٹ کیے گئے۔

میں ماں بننے والی تھی۔ بہت خوش ہوئی۔ پہلی بار ماں بننے کا احساس ہوا۔ ایسا احساس جو سب سے خوبصورت ہوتا ہے۔ مکمل ہوتی ہے، یہاں ہر عورت کی کہانی۔ میں پھولے نہیں سما رہی تھی، سوچ سوچ کر ہی میری ممتا انگڑائیاں لینے لگتی، میں اپنے آنگن میں کھلنے والے پھول کی آبیاری بڑے پیار سے کرنے لگی۔

ممتاز بیگم کو، ایک دن خیال آیا کہ کیوں نہ بہو کا الٹراساؤنڈ کیا جائے، کہیں اس کی کوکھ میں پلنے والی لڑکی تو نہیں، اس خیال کے ساتھ ہی اس نے ایک جھرجھری لی اور فیصلہ کیا کہ شاذیہ کا الٹراساؤنڈ ہوگا۔ الٹراساؤنڈ کا نام سنتے ہی میں حیران رہ گئی۔ میں نے شرجیل سے سوال کیا کہ شرجیل یہ ہماری پہلی اولاد ہے۔ ہمارے لئے انمول تحفہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ماں کی ضد ہے بس اور ماں کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ شرجیل نے دوٹوک کہہ دیا۔

شرجیل ماں کی بات کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ ماں کی بات اس کے لئے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ پہلی بار پانچ ماہ کے حمل کے دوران میرا الٹرا ساؤنڈ ہوا۔

میری بدنصیبی تھی ! اس لئے کہ لڑکی اگر کوکھ میں ہے تو کوکھ اجاڑ دی جائے گی۔ میرے لئے تو اولاد نعمت تھی۔ لیکن لڑکی کی بنیاد پر کوکھ میں قتل کرنا۔ یہ مجھے قطعی قبول نہیں تھا۔ لڑکی میری کوکھ میں پنپ رہی تھی۔

گھر میں بھونچال آ گیا، ممتاز بیگم بضد تھیں کہ حمل ساقط (Abortion) کیا جائے۔ شرجیل بھی ماں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میری خوشیاں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ ساس کے تیور بدل گئے۔ شرجیل کا ہمیشہ موڈ خراب رہنے لگا۔ مجھے لگنے لگا گویا میں عظیم گناہ گار ہوں۔ میری منت سماجت بھی کام نہیں آئی۔ میں نے ہر طرح کی کوشش کی جس سے ماں بیٹے کا ارادہ بدل جائے۔ کوئی دلیل کام نہیں آئی۔ مجھے زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ میں ایک بھکارن کی طرح جی رہی تھی۔ تحفظ کے نام پر بے بسی کی انتہا تھی۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی اولاد کو دنیا میں آنے سے پہلے قتل کرنے پر مجبور بے بس ماں۔

اپنے دل کی تڑپ اور ضمیر کی ملامت مجھے چین لینے نہیں دے رہے تھی۔ آخر شرجیل اور ممتاز بیگم کی جیت ہوئی۔ ممتا ہار گئی۔ میں ہار گئی۔ ننھی سی جان دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں سوگئی۔ ہم عورتیں کتنی لاچار ہیں، تمام صلاحیتوں کے باوجود رشتوں کی بھینٹ چڑھتی ہیں، کبھی عزت کے جھوٹے نام پر۔ کبھی دوسروں کی انا کی خاطر۔

شرجیل سے نفرت کی چنگاری میرے دل میں سلگتی رہی اس کی تپش میں روز میری خوشیاں پگھلتی رہیں۔ شرجیل کے قریب آنے پر مجھے گھن آرہی تھی۔ لیکن میں مجبور تھی۔ دنیا کے بنائے ریتی رواجوں سے کب تک شرجیل سے دور رہتی۔ ہاں ! پہلے شرجیل کے قریب آنے پر میرے جذبات کے سوتے امڈ پڑتے تھے۔ اب وہاں برف جم گئی تھی۔ تمام جذبات سرد ہو گئے تھے۔ محبت مر چکی تھی۔ خواہشیں مردہ ہو گئیں تھیں۔ لیکن ان سب کے باوجود میں کھوکھلے ریتی رواج اور رشتوں کو باندھے لے کر چل رہی تھی۔ میں وفا شعار بیوی ہونے کا فرض نبھاتی رہی۔

پھر ایک دن مجھے اپنے وجود سے ننھی جان نے دوبارہ آواز دی۔ دوسری بار اللہ تعالیٰ نے مجھے ماں بننے کا شرف بخشا۔ پھر نئی امنگوں کے احساس نے سوئی ہوئی ممتا کو جگایا۔ دوبارہ پھر سے ممتاز بیگم اور شرجیل نے الٹرا ساؤنڈ کی ضد کی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے زور سے چلایا۔

کیوں؟؟؟ بار بار میرے صبر کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ میری ممتا کو گالی دی جا رہی ہے۔ اگر پھر سے لڑکی کی شناخت ہوئی تو دوبارہ Abortion کیا جائے گا۔ قانون بھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اب نہیں، کبھی نہیں، یہاں نہیں رہنا ہے شرجیل۔ یہاں ہر طرف تعفن ہی تعفن ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اس گھر میں جگہ جگہ ننھی لاشوں کے خون میں لت پت ننھے ننھے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ دیواروں سے لہو ٹپک رہا ہے۔ میں دوبارہ قاتل نہیں بنوں گی شرجیل۔ میں پھر سے گناہ عظیم کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ تمہارے گھر سے تمہاری دنیا سے دور جا رہی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ میں اپنی اولاد کو جنم دوں گی اور دنیا کو دکھاؤں گی۔ ایک ماں کتنی بہادر ہوتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ارادے مضبوط تھے۔ یہ ارادے ایک عورت کے تھے۔ایک ماں کے تھے۔ میں اس قید نما زندگی سے باہر نکلی۔ دور سورج اپنی تمام تر روشنیوں کے ساتھ چمک رہا تھا۔افق پر سیاہ بادل چھٹ گئے تھے۔بس نور ہی نور برس رہا تھا۔ یہ نور تھا ایک عورت کے اعتماد۔اس کی بہادری اور ہمت کا۔

اسلام اور عورت

اسلام کے تصورات سے جو مغز لیا جاتا ہے وہ عملی زندگی کا بہترین نمونہ ہے، دراصل زندگی کے بارے میں جو بھی بنیادی تصورات ہیں وہ اسلامی نظام میں ساری تفصیلات اور قانونی ضابطے قرآن کریم میں پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ زمین وآسمان اوران کے بیچ پائی جانے والی ہر شئے کا مالک ہے، انسان کو اللہ نے دولت سے نوازا اوراس کو امانت کی طرح تصرف میں دیا اور پھر اس نے جوڑے پیدا کئے آپس میں محبت سے رہنے کی تلقین کی، انسانوں کو ایک دوسرے کے لئے رشتے استوار کیے سب کی فلاح وسعادت کے اصول اور حقیقی مفادات ان کے درمیان فطری رشتہ اخوت وتعاون کا معاملہ عطاء کیا۔

زندگی کے مرحلے میں قانون اسلام نے عورت پر مرد کو فوقیت دی قوت، خاندان کی کفالت کی ذمے داری کے اعتبار سے، اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر دور میں عورت کے ساتھ ناانصافیاں ملیں اور اس کو مقدس فہرست کے زمرے سے ہٹا دیا بلکہ اس کو ملکیت اور خود کو مالک کے طور پر برتنے لگے۔

کسی آدمی کا اپنی بیوی پر ذاتی حق نہیں رہتا، جو حقوق وشرائط کی تکمیل کے لئے اللہ

نے عطا کیا ہے پس انہی حقوق کو یکساں حیثیت سے استعمال کیا جائے۔ مستقل قبضہ کر کے اس کو ذہنی جسمانی اور روحانی تکلیف نہ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ زیادہ حقوق مرد حضرات کی جھولی میں ڈال کر محترم ٹھیرایا ہے۔

اس سلسلہ کی کڑی ایک دوسرے سے جڑ کر اب وہ ایک مضبوط زنجیر بن چکی ہے۔ اسی خصوصی اختیار کی وجہ سے عورتوں پر ظلم کی کہانیاں ان زنجیروں میں قید ہیں۔ سماج کی ذمے دار شخصیتوں نے بھی عورتوں کے حق میں چند الفاظ دعا کے طور پر کہہ دیئے ہیں۔ مجمع سے مخاطب ہوتے ہیں تو عورتوں کے حق میں کافی دلائل پیش کرتے ہیں لیکن خود ان کے گھروں میں ناانصافیاں پنپتی رہتی ہیں اور کہیں نہ کہیں عورتوں کے حقوق چھین کر مرد کو خود مختار بنا دیا جاتا ہے۔

یہ لوگ مذہب کی آڑ میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کرتے ہیں کبھی حیا کے نام پر کبھی گھر کی عزت کی دہائیاں دے کر۔ کبھی کسی مخصوص گفتگو میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتے۔ خواہ وہ معاملہ خود اس کے گھر اور بچوں کا کیوں نہ ہو۔

عورت کو ایک object کی طرح استعمال کرنا، اس کو مقصد تخلیق کا درجہ دے کر خود مالک بن بیٹھے ہیں۔ آدمیوں کے بے جا اختیارات کی وجہ سے اغراض کے لئے استعمال کی جانے والی ایک شئے کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ اس کو مطلق اختیار حاصل نہیں کہ اپنی پسند کی زندگی گزارے۔ اسلام نے آدمی کو اس بات کی ضمانت دی ہے کہ وہ اللہ کے قوانین کی پابندی کرے۔ عورتوں کے حقوق سلب نہ کرے۔

اللہ نے شریعت کے ذریعے آدمیوں کو دیئے گئے مقصد وجود کے تحت کام کرنے کی

تلقین دی ہے ورنہ وہ خدا کی عدالت میں سخت سزا کے مستحق ہیں۔ سورہ روم آیت نمبر ۲۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خلق لکم من انفسکم ازواجا تسکنوا الیھا (اے انسانو! اللہ نے تمہارے لئے تم ہی میں سے تمہارے جوڑے (صنف مقابل) پیدا کئے ہیں، تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔)

اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسانوں کو عطاء کی ہیں وہ صرف آدمیوں کی میراث نہیں بلکہ عورتوں کو بھی مستفید ہونے کا موقعہ ملے اور خدا کی نعمتیں تمام بندوں کے لئے عام ہیں۔ اس کا مطلب ہر چیز سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے دونوں کے اختیارات برابر ہیں۔ مرد اور عورت میں نہ کوئی حاکم ہے اور نہ کوئی محکوم۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب کچھ مشترک نہیں ہے بلکہ اسلامی فلسفے کی بنیاد پر اختیارات کی مساویانہ تقسیم ہونی چاہئے۔

قرآن مجید نے اسلامی قانون کے لحاظ سے جو ماڈل تیار کیا ہے۔ وہ مکمل ایمان داری کے ساتھ بتائیں نہ کہ غیر ضروری تصورات کو چسپاں کریں۔ اپنے مفاد کی خاطر عورتوں کے لئے دایرے مختص نہ کریں۔ کسی قسم کا تضاد نہ کریں۔ اس طرح اسلام عورتوں کے لئے قانونِ الٰہی کے، احکام و ہدایت کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتا ہے جس سے گھروں میں ایک دوسرے کے لئے محبت و عزت پیدا ہوتی ہے۔ دونوں کی یکساں حیثیت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

عورت سے محبت و عزت کو لازم قرار دیا ہے۔ تمہاری عورتوں کے حقوق کے لئے اسلام میں صالح تقاضہ موجود ہے۔ مرد اپنا فریضہ پہچانیں۔ شریعت کی مقرر کی ہوئی حدوں کو تجاویز نہ کریں۔ اگر آدمی اپنی حدیں عبور کرنا چاہے تو اسلام کو پورا حق ہے کہ

انھیں روکے اور اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے تیں نرم گوشہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور اس سے وہی کام لیے جائیں جو مقصد تخلیق سے ہم آہنگ ہو۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کی سند حاصل ہوگی۔

خسرو فاؤنڈیشن-ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی،لسانی اورتہذیبی تکثیریت کا ملک ہے، کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے،اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے،جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے، ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں کہ دنیا کوکس کی نظرلگ گئی کہ سماجی قربتیں فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اورتفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگرخاموش رہےتو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کردیتی ہے۔اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گردطواف کرر ہے ہیں۔غم زمانہ کی جگہ درد تنہا سے دو چار ہیں اوروہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت ودریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا،اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو''محبتوں کی گاتھا'' اور''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کوایک دوسرے سے جوڑے رہیں جن کے

نزدیک مادرِوطن، وہاں پیدا ہونے اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھراس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔ اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں اور یہ ٹکراؤ جو گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتا ہیاس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکرمندی ہے جس کے تحت ''خسرو فاؤڈیشن'' کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مو※رخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں ناگوں

صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے ناموں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف خسرو بلکہ ہماری تاریخ کا ہر جز انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس وغم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال و قال، جنگ و جدل، سوز و ساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم و ادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ

مذہبی ہو یا تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔ خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بنانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوق:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

□□□

Raakh Mein Dabi Chingaari

Nasreen Hamza Ali

نسرین حمزہ علی ایک ہندوستانی ادیبہ، شاعرہ اور مصنفہ ہیں۔ ان کا تعلق دکن کی ریاست تلنگانہ کے تاریخی شہر حیدر آباد سے ہے اور وہ صوبہ کرناٹک کے تہذیبی شہر بیدر میں مقیم تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''اک لمحہ'' اور ''دھوپ کا نم'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں اور شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ جب اسے پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمارے ہی دل کی آواز اور ہمارے ہی جذبات کو الفاظ کی شکل میں ڈھالا گیا ہے، سوچ کی بلندی اور فکر کی گہرائیوں نے ان کی تحریروں کو ایک معیار عطا کیا ہے۔ نسرین ایک باشعور معاشرتی فرد ہیں جو اپنی تحریروں میں جذبات و احساسات کو زندہ رکھتی ہیں۔

نسرین کی تحریروں میں عورتوں کے درد، تہذیب و اقدار کے زوال کا دکھ اور نسل کی بنیاد پر ناروا رویوں کی مذمت پائی جاتی ہے۔ نسرین ایک باوقار معاشرتی فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل اور پُروقار عورت کی امیج پیش کرتی ہیں جس میں نسوانیت، نزاکت و جمال، محبت و قربانی کے ساتھ ایک مکمل وجود کی تصویر بنتی ہے۔ جو اپنی نسوانیت سے بھی آگاہ ہے اور طبقاتی معاشرتی مسائل کا ادراک بھی رکھتی ہے۔ نسرین قومی مشاعروں کے علاوہ آن لائن بین الاقوامی مشاعروں میں بھی اپنی شاعری کو پیش کر چکی ہیں۔ ان کی نظمیں و غزلیں اور مضامین قومی و بین الاقوامی اخبارات، میگزین، ٹی وی چینلس، بلاگ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمس پر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے
Motivational Strips World's Most Active Writers Forum
کی جانب سے Rabindranath Tagore Memorial Certificate اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی طرف سے قاضی نذر الاسلام ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

ख़ुसरो फ़ाउण्डेशन خسرو فاؤنڈیشن
KHUSRO FOUNDATION
D-319, Defence Colony, New Delhi-110024 +91 9318431341

ISBN:978-81-989382-4-4
9 788198 938244

@Khusrofounda @khusrofoundation @foundationkhusro @khusro_foundation

Rs. 100-